تحریکِ آزادی میں فتاویٰ کا کردار

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی

ہندوستان میں اسلام کے تعارف وفروغ کا سلسلہ ساتویں صدی عیسوی میں جنوبی علاقہ بالخصوص مالابار میں عرب تاجروں کے ذریعہ شروع ہوا۔ اس سرزمین پر مسلمانوں کی سب سے پہلی حکومت سندھ میں آٹھویں صدی عیسوی کے شروع میں قائم ہوئی۔ شمالی ہندوستان میں ان کی باقاعدہ حکومت تیرہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں دہلی سلطنت کے نام سے وجود میں آئی۔ سولھویں صدی عیسوی میں مغل بادشاہت قائم ہوئی جو دستوری طور پر ۱۸۵۷ء تک باقی رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے حکومت کے قیام کے ابتدائی دور ہی سے اس ملک کو اپنا وطن سمجھا اور اس کی ترقی اور فلاح و بہبود کے کاموں کی انجام دہی کو اپنا فریضہ تصور کیا۔ اسی تصور کے تحت انھوں نے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا اور اس کے حصول کے لیے اپنا وقت اور جان و مال سب کچھ قربان کرنے میں دریغ نہیں کیا۔ اس سلسلہ میں علماء ہند کی خدمات نمایاں رہی ہیں۔ انھوں نے عملی جدوجہد کے علاوہ تقریر و تحریر کے ذریعہ تحریکِ آزادی کے کاز کو فروغ دینے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ ان کی ان خدمات میں مختلف مناسب مواقع پر فتاویٰ کا اجراء بھی شامل ہے، جن سے تحریک آزادی میں مسلمانوں کی سرگرمی کو تقویت پہنچی، اس کے پروگراموں کو عام مقبولیت حاصل ہوئی اور تحریک آزادی کو آزادی سے ہم کنار ہونے میں بڑی مدد ملی۔

اصل بحث سے قبل یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ کسی مفتی یا ماہر فقہ کی جانب سے ازخود یا کسی کے سوال کے جواب میں کسی مسئلہ پر شریعت کے نطقۂ نظر کی وضاحت فتویٰ کہلاتی ہے۔ فتویٰ دریافت کرنے والے کو مستفتی اور فتویٰ دینے والے کو

مفتی کہا جاتا ہے۔اس طرح مفتی کسی مسئلہ پر اپنی جو رائے ظاہر کرتا ہے وہی دراصل 'فتویٰ' ہے جس کی جمع 'فتاویٰ' ہے۔فتویٰ پوچھنے (استفتاء) اور فتویٰ دینے (افتاء) دونوں کے مقررہ اصول وضوابط ہیں۔ فتویٰ کی صحت کے لیے ان کا پاس ولحاظ ضروری ہے۔[۱] 'افتاء' فقہ اسلامی کا ایک اہم باب اور اسلام کے نظامِ قضا کا ایک ضروری جز ہے۔ پیش آمدہ مسائل میں عام مسلمانوں کی رہ نمائی کے علاوہ مفتی مقدمات کے فیصلہ میں قاضی کے مشیر ومعاون کے فرائض بھی انجام دیتے رہے ہیں۔مسلم معاشرہ میں کسی مسئلہ پر فتویٰ کو خاص اہمیت اس وجہ سے دی جاتی ہے کہ اس سے درپیش مسئلہ میں شریعت اسلامی کا موقف معلوم ہوتا ہے جو قرآنی آیات، احادیث نبوی ﷺ یا ان کی ترجمانی پر مبنی ہوتا ہے۔اسی لیے اس پر عمل کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں افتاء یا فتویٰ کے اجراء کا سلسلہ مسلم حکومت کے قیام کے اولین عہد سے شروع ہوا، اس لیے کہ کسی بھی مسلم معاشرہ میں شرعی نقطۂ نظر سے مسائل کی وضاحت اس کی اہم مذہبی ضروریات میں شامل ہوتی ہیں۔فتاویٰ کے مجموعوں کی ترتیب وتدوین بھی مسلم حکومت کے پہلے دور یعنی عہدِ سلطنت میں شروع ہوئی جو مغل دور میں مزید سرگرمی کے ساتھ جاری رہی۔[۲] اس ملک میں مسلم حکومت کے خاتمہ کے بعد بھی علماء مختلف مسائل پر شرعی نقطۂ نظر واضح کرتے رہے، جن میں برطانوی عہد میں ہندوستان کی شرعی حیثیت اور تحریکِ آزادی کے اہم پروگراموں سے متعلق فقہی رائے کا اظہار یا فتویٰ کا اجراء شامل تھا۔ یہ فتاویٰ انگریزوں کے خلاف جدّ وجہد کے لیے ذہن سازی کرنے اور تحریکِ آزادی کے مختلف مراحل میں پورے جوش وخروش کے ساتھ شرکت کے لیے فضا ہموار کرنے میں کافی معاون ثابت ہوئے۔

ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ میں شاہ عبدالعزیز دہلویؒ (۱۷۴۶-۱۸۲۴ء) کا فتویٰ (جاری شدہ ۱۸۰۳ء) بنیادی اہمیت رکھتا ہے، اس لیے کہ انھوں نے اپنے عہد کے ہندوستان کو 'دارالحرب' قرار دے کر خاص طور سے مسلمانوں میں یہ تحریک پیدا کی کہ وہ اس صورت حال میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے انگریزوں کے خلاف جدّ و جہد کریں۔ اس استفتاء (سوال) کے جواب میں کہ انگریزوں یا دوسرے

غیر مسلموں کے قبضہ یا کنٹرول (عمل داری) میں ملک کا جو حصہ ہے وہ دارالحرب ہے یا نہیں؟ شاہ عبدالعزیزؒ پہلے یہ واضح کرتے ہیں کہ دارالاسلام کب دارالحرب ہوجاتا ہے؟ پھر آخر میں علماء کی جس جماعت کے موقف سے وہ اتفاق کرتے ہیں اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''علماء کی ایک تیسری جماعت بھی ہے اور اس نے اس سے بھی ترقی کی ہے اور یہ کہا ہے کہ دارالحرب اس کو کہتے ہیں کہ وہاں نہ کوئی مسلمان اور نہ کوئی کافر ذمی امن سے سابق پناہ کے ذریعہ ہووے، خواہ بعض شعائر اسلام وہاں ترک کردے گئے ہوں یا نہ ترک کیے گئے ہیں اور خواہ باعلان شعائر کفر نے وہاں رواج پایا ہو یا نہ رواج پایا ہو اور اسی قول ثالث کو محققین نے ترجیح دی ہے اور باعتبار اس قول ثالث کے عمل داری میں انگریزی کی اور ان کے مانند اور دوسرے غیر اسلام کی عمل داری بلاشبہ دارالحرب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔''[۳]

ایک دوسرے مقام پر خاص دہلی کے حوالہ سے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''دارالاسلام دارالحرب نہیں ہوسکتا جب تک تین امور پائے جاویں۔ وہاں مشرکین کے احکام جاری ہوجاویں اور وہ دارالاسلام دارالحرب سے مل جائے اور وہاں کوئی مسلمان باقی نہ رہے اور نہ وہاں کوئی ایسا کافر ذمی رہ جاوے جو پہلے مسلمانوں سے پناہ لے کر رہا ہو اور اب بھی اس کی پناہ سے ہو... اس شہر میں مسلمانوں کے امام کا حکم ہرگز جاری نہیں ہے، نصاریٰ کے حکام کا حکم بے دغدغہ جاری ہے اور احکام کفر کے جاری ہونے سے یہ مراد ہے کہ مقدمات انتظام سلطنت و بندوبست رعایا و تحصیل خراج و باج و عشر اموال تجارت میں حکام بطورِ خود حاکم ہوں اور ڈاکوؤں اور چوروں کی سزا اور رعایا کے باہمی معاملات اور جرموں کی سزا کے مقدمات میں کفار کا حکم جاری ہو ... جب تک یہ اجازت نہ دیویں کوئی

مسلمان اور کافر ذمی ان اطراف میں نہیں آ سکتا۔ مصلحتاً واردین اور مسافرین اور تاجروں سے مخالفت نہیں کرتے اور اس شہر سے کلکتہ تک ہر جگہ نصاریٰ کا عمل ہے، البتہ داہنے بائیں مثلاً حیدرآباد، لکھنؤ اور رامپور میں ان کا حکم جاری نہیں، کیوں کہ ان مقامات کے والیان ملک نے ان سے صلح کر لی اور ان کی فرماں برداری منظور کر لی۔''[۴]

یہاں یہ وضاحت بے موقع نہ ہوگی کہ اہل علم کے ایک طبقہ میں یہ خیال بھی پایا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت کے خلاف اصلاً شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۷۰۳-۱۷۶۲ء) کی تحریروں سے فضا ہموار ہوئی۔ گرچہ انھوں نے باقاعدہ یہ فتویٰ جاری نہیں کیا کہ ہندوستان 'دارالحرب' ہے اور وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے، اس لیے کہ ان کے عہد (اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف اول) میں مغل بادشاہت انتشار، کم زوری وعدم استحکام کا شکار ضرور ہوگئی تھی، تاہم ابھی ان کی سیاسی بالادستی قایم تھی اور دہلی پر انگریزوں کا تسلط نہیں تھا، لیکن ان کی تحریروں بالخصوص امیر الامراء نجیب الدولہ اور شاہ احمد ابدالی (۱۷۲۴-۱۷۷۳ء) کے نام ان کے خطوط سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انھیں ملک میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرات اور ان کے عواقب کا احساس تھا۔ اس خطرہ سے نپٹنے کے لیے بہ ظاہر ان کے ذہن میں جو پروگرام تھا اس میں اول مرہٹوں و جاٹوں پھر سکھوں سے مقابلہ اور ان کا استیصال اور آخر میں انگریزوں سے نبرد آزمائی اور ایک پرامن اسلامی ریاست کا قیام تھا۔[۵] یہاں یہ واضح رہے کہ نواب عبداللہ خاں کے نام خط میں شاہ صاحب نے بعض علاقوں کو، جہاں جاٹوں کا غلبہ تھا، واضح طور پر 'دارالکفر' قرار دیا تھا اور انھیں وہاں سے نقل مکانی کی نصیحت کی تھی۔[۶] اسی ضمن میں یہ ذکر بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ شاہ ولی اللہؒ نے 'فیوض الحرمین' میں مکہ مکرمہ میں (۲۱ ذی قعدہ ۱۱۴۴ھ/ اپریل ۱۷۳۲ء کی شب میں) ایک خواب دیکھنے کا ذکر کیا ہے جس میں انھیں یہ دکھایا گیا کہ کفار کا سردار مسلمانوں کے شہروں پر غالب آ گیا ہے اور انھیں غارت گری اور قید و بند کا شکار بنا دیا ہے، اجمیر جیسے شہر میں اسلامی احکام کے بجائے احکامِ کفر جاری ہیں۔ اس صورت حال میں اللہ تعالیٰ کے غضب کو

محسوس کر کے وہ خود غصہ سے بھر جاتے ہیں جس کا اثر آس پاس میں جمع ہجوم پر بھی ہوتا ہے اور وہ پوچھتے ہیں کہ اللہ کی رضا کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ تمام نظام کو توڑ کر (فک کل نظام) ۔ پھر وہ دیکھتے ہیں کہ لوگوں کا ہجوم ان کی سربراہی میں ایک شہر سے دوسرے شہر جا کر غلبہ حاصل کرتا جا رہا ہے، یہاں تک اجمیر پہنچ کر کفار کے سردار کو تہِ تیغ کر ڈالا۔ اس طرح ان کے توسط سے سیاسی انقلاب برپا ہوا اور وہ مسلمانوں کے امام قرار پائے۔ ۷ بہ قول مولانا فیصل احمد بھٹکلی ''یہ کتنا کھلا خواب ہے، مستقبل کے کتنے انقلابات اس میں صاف دکھایے گئے ہیں... مستقبل قریب کے لحاظ سے دیکھیں تو یہ مرہٹوں پر پوری طرح صادق آتا ہے اور اگر مستقبل بعید تک اس کو وسعت دی جائے تو انگریزوں پر فٹ ہوتا ہے''۔ ۸ بہر حال نجیب الدولہ کے نام شاہ صاحب کے خط سے ان کے مرتّبہ پروگرام کی بابت واضح اشارے ملتے ہیں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''تا وقتیکہ استیصال ایں سہ فرقہ نمی شود بادشاہے مطمئن شدہ می نشیند، نہ امراء و نہ رعیت بفراغ خاطر می تواند زیست، مصلحت دینی و دنیوی ہر دو دراں منحصر است کہ بعد فتح مرہٹہ بیدرنگ متوجہ قلعہ جات جت شوند و آنرا بہ نیروے برکات غیبیہ میسر فتح نمایند۔ بعد ازاں نوبت سکھ است آنجماعہ را نیز زیر و زبر باید ساخت و منتظر نفحات الٰہیہ باید بود''۔ ۹
>
> (جب تک ان تینوں فرقوں کا استیصال نہ ہوگا نہ کوئی بادشاہ مطمئن ہو کر بیٹھے گا، نہ امراء چین سے بیٹھیں گے اور نہ رعیت خاطر جمعی سے زندگی بسر کر سکے گی۔ دین و دنیا کی مصلحت اسی میں ہے کہ مرہٹوں سے جنگ جیتنے کے بعد فوراً قلعہ جات جٹ کی طرف متوجہ ہو جائیں اور اس مہم کو بھی برکات غیبیہ کی مدد سے آسانی کے ساتھ سر کر لیں۔ اس کے بعد نوبت سکھوں کی ہے اس جماعت کو بھی شکست دینی چاہیے اور رحمتِ الٰہی کا منتظر رہنا چاہیے)۔ ۱۰

گرچہ اس خط میں، یا دوسرے خطوط میں انگریزوں کے بارے میں اظہارِ خیال یا ان کے خلاف باقاعدہ جدّو جہد شروع کرنے کا ذکر نہیں ہے، لیکن شاہ صاحب

کے بعد مسلم زعماء وعلماء نے اسی ترتیب سے آگے بڑھ کر انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی کا آغاز کیا۔ دوسرے یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ شاہ صاحب کی دعوت پر ہی شاہ ابدالی مرہٹوں سے مقابلہ کے لیے ہندوستان آئے تھے، پھر ۱۷۶۲ء میں انہی کی زندگی میں سکھوں سے مقابلہ کیا۔ اپنی مہم کو آگے بڑھاتے ہوئے ۱۷۶۷ء میں آٹھویں حملہ کے دوران انگریزوں (جو اس وقت بنگال پر قبضہ جما چکے تھے) سے مقابلہ کے لیے فوج کا ایک دستہ الٰہ آباد روانہ کیا، تاکہ اودھ میں ان سے مقابلہ کیا جائے۔ گرچہ ہندوستان میں قیام کے دوران شاہ احمد ابدالی اور شاہ ولی اللہ کے مابین ملاقاتوں کی تفصیلات سے مآخذ خاموش ہیں، لیکن قرینِ قیاس یہی ہے کہ شاہ صاحب نے ان کو اپنا پورا پروگرام سمجھا دیا ہو۔[۱۱] اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں اس کی شرعی حیثیت کے بارے میں شاہ صاحب کا جو نقطۂ نظر تھا اس سے متعلق مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی یہ رائے بہت متوازن معلوم ہوتی ہے:

> ''گرچہ ہماری نظر سے کہیں نہیں گزرا کہ شاہ صاحب نے ملک کو دارالحرب کہا ہو، لیکن وہ ملک کا جو نقشہ کھینچتے اور اس کے جو حالات بیان کرتے ہیں وہ ہرگز کسی دارالاسلام کے نہیں ہو سکتے اور اس بنا پر بلا تکلّف کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نیم شعوری ذہن میں ہندوستان کے دارالحرب میں منتقل ہو جانے کا تصور موجود تھا''۔[۱۲]

اس میں شبہ نہیں کہ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے فتویٰ کو تاریخی حیثیت حاصل ہے اور تحریکِ آزادی کی تاریخ میں اسے بجا طور پر بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس فتوی کی ابتدا میں انھوں نے جس وضاحت کے ساتھ ہندوستان کے سیاسی حالات، مسلمانوں کے مذہبی و سیاسی اختیارات اور ان کی سماجی صورت حال بیان کرنے کے بعد اس ملک کی شرعی حیثیت پر اپنی فقہی رائے ظاہر کی ہے اس کی نظیر اس نوعیت کے کسی دوسرے معاصر فتویٰ میں نہیں ملتی۔ درحقیقت یہ فتوی انگریزوں کے خلاف جدو جہد کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس فتویٰ کو علماء وعوام میں جو شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی اس سے تحریکِ آزادی ہند کی بنیاد پڑی۔ اس فتویٰ سے ایک اور اہم نکتہ سامنے آتا ہے جس پر کم توجہ دی گئی اور وہ یہ کہ

شاہ صاحب نے دہلی پر انگریزوں کے غلبہ کے بعد فتویٰ جاری کرتے ہوئے اس کا جو پس منظر بیان کیا تھا اس میں انھوں نے صاف طور پر یہ لکھا تھا کہ اب (نصاریٰ کے اختیار کے تحت) مسلم یا ذمی (غیر مسلم) کوئی بھی اس امن (کی حالت) میں نہیں ہے جو انھیں پہلے (یعنی مسلم حکومت کے تحت) ملا ہوا تھا، دوسرے عام لوگ خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم اس درجہ مجبور و بے بس ہو گئے ہیں کہ انگریزوں کی اجازت کے (یا ان سے پروانہ لیے) بغیر دہلی اور اس کے اطراف میں نہیں آ سکتے۔[١٣] (ہیچ مسلمان یا ذمی بغیر استیمان ایشاں دریں شہر و درنواح نمی تواند آمد) اس میں دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں:

١- مسلم حکومت کے تحت مسلم و غیر مسلم دونوں کو تحفّظ فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

٢- علماء ہند نے برطانوی تسلّط کے خلاف جو زوردار آواز اٹھائی اور اس سے نجات کے لیے جو جنگ چھیڑی اس سے مسلم و ہندو سب، بلکہ پورے ملک کا بھلا مقصود تھا۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی کے مذکورہ فتویٰ کے مشتملات پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے بجا فرمایا ہے:

> ''حضرت شاہ صاحب نے انگریزوں کے خلاف جو ظلم و ستم کی شکایت کی ہے اس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کا بھی ذکر کیا ہے، دونوں شہر دہلی میں امن کا پروانہ لیے بغیر نہیں آ سکتے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب انگریزوں کے مظالم سے صرف مسلمانوں کی نہیں، بلکہ ہندوؤں کی بھی گلوخلاصی چاہتے تھے''۔[١٤]

یہاں یہ ذکر بھی بے موقع نہ ہوگا کہ شاہ ولی اللہ نے مغل حکم رانوں کو اپنے مخالفین کو زیر کرنے کے بعد حکومت کے نظم و نسق کو درست کرنے کے لیے جو نصیحتیں کیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ دہلی میں کسی کی جانب سے کسی مسلم یا غیر مسلم (ذمی) کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہونے پائے، یعنی مسلم و غیر مسلم دونوں کے تحفظ کا اہتمام ہو۔ نجیب الدولہ کو اسی طرف متوجہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایں بار اگر می خواہند کہ کار دست بستہ میسر شود قدغن بلیغ باید نمود کہ کسی

بامسلمانان وذمیان دہلی کارنداشتہ باشند“ ۱۵؎

(اس بار اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ نظم ونسق درست ہوجائے تو پوری پوری تاکید کرنی چاہیے کہ دہلی کے مسلمانوں اور ذمیوں (غیر مسلموں) سے کوئی تعرض نہ کرے)

شاہ عبدالعزیزؒ کے فتویٰ کی اہمیت سے قطع نظر بعض جدید محققین کے خیال میں اس نوع کا سب سے پہلا فتویٰ شاہ ولی اللہ کے قریبی شاگرد اور شاہ عبدالعزیز کے رفیق قاضی ثناء اللہ پانی پتی (۱۷۳۰-۱۸۱۰ء) نے جاری کیا، گرچہ وہ مشہور نہ ہوسکا۔ ’تحریک آزادی میں علماء کا کردار (۱۸۵۷ء سے پہلے)‘ کے مصنف مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی نے اس فتویٰ کی اوّلیت کا احتمال ظاہر کیا ہے۔ ۱۶؎ جب کہ ممتاز عالم ومحقق مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی نے ان سے زیادہ واضح لفظوں میں اس فتویٰ کے مقدم ہونے کا ذکر کیا ہے۔ خود ان کے الفاظ میں:

”ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شمالی ہند کے دارالحرب ہونے کا برملا فتویٰ دینے میں حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب کو اولیت حاصل ہے۔ ہر چند کہ شہرۂ عام حضرت شاہ صاحب کے فتوی کو حاصل رہا“۔ ۱۷؎

بہرحال ہندوستان کی شرعی حیثیت سے متعلق شاہ عبدالعزیز دہلویؒ اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے جو فقہی موقف اختیار کیا، علماء وقت پر اس کے بڑے گہرے اثرات پڑے، متعدد علماء نے اس مسئلہ پر از سرنو غور وخوض کیا، ملک کے حالات اور مسلمانوں کو درپیش مسائل کی روشنی میں اپنی فقہی آراء متعین کیں اور اکثریت نے مذکورہ موقف سے اتفاق ظاہر کیا۔ جس کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف آواز زیادہ شدت سے بلند ہونے لگی۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف اول میں اس نوع کے فتاویٰ صادر کرنے والے ممتاز علماء میں شاہ رفیع الدین دہلوی (۱۷۴۹-۱۸۱۸ء)، مولانا عبدالحئی بڈھانوی (م۱۸۲۸ء) مفتی الٰہی بخش (۱۷۴۹-۱۸۳۱ء)، شاہ اسمٰعیل شہید (۱۷۷۹-۱۸۳۱ء) اور سید احمد شہید (۱۷۸۶-۱۸۳۱ء) شامل ہیں۔ مشہور اردو مترجم قرآن شاہ رفیع الدین اپنے بھائی شاہ عبدالعزیز کے زیر تربیت رہے ہیں، انھوں نے دارالحرب کے شرائط و

لوازم سے متعلق فقہی توضیحات کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اس ملک کے بارے میں معاصر علماء کی اختلافی آراء کا جائزہ لیا اور یہ واضح کیا کہ موجودہ صورت حال میں ہندوستان کا دارالحرب ہو جانا قول راجح ہے۔ خود انھوں نے بھی اسی رائے کو قابلِ ترجیح قرار دیا کہ ہندوستان دارالحرب ہو گیا ہے، اس لیے کہ اس میں وہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں جو دارالاسلام کے دارالحرب ہونے کے لیے ضروری خیال کی جاتی ہیں (ایں ہمہ امورایں جا موجود اند پس دارالحرب است) [۱۸]۔ سید احمد شہیدؒ کی پوری تحریک جہاد اسی تصور پر مبنی تھی کہ ہندوستان پر غیر مسلموں کے قبضہ کے بعد اب اس کے دارالحرب ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا ہے اس لیے اس صورت حال میں تبدیلی کے لیے اہل اسلام پر جہاد فرض ہو گیا ہے ۔ 'صراط مستقیم' میں ۱۸۱۸ء کے واقعات کے ضمن میں یہ مذکور ہے کہ انھوں نے جہاد کے ظاہری و باطنی فوائد و برکات بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ اس وقت ملک کا اکثر حصہ دارالحرب ہو گیا ہے۔ [۱۹] اس کے علاوہ سید صاحب نے اپنے مکاتیب میں جا بجا اس مسئلہ پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ مثلاً شاہ بخارا کے نام خط میں لکھتے ہیں:

> ''کفار فرنگ کہ برسر ہندوستان تسلط یافتہ اند نہایت تجربہ کار، ہوشیار وحیلہ باز ومکار اندر اگر برسر اہل خراسان بیایند بہ سہولت تمام جمیع بلاد آنہا را بدست آرند۔ باز حکومت آنہا بولایت آنجناب (یعنی بخارا) متصل گردد و اطراف دارالحرب بہ اطراف دارالاسلام متحد شود''۔
>
> (جو فرنگی ہندوستان پر قابض ہوئے ہیں وہ بے حد تجربہ کار، ہوشیار، حیلہ باز اور مکار ہیں۔ اگر اہل خراسان (افغانستان) پر چڑھائی کر دیں تو سہولت کے ساتھ ان کے ملک پر قابض ہو جائیں گے۔ پھر ان کی حکومت کی حدیں آپ کی حکومت سے مل جائیں گی۔ دارالحرب اور دارالاسلام کی سرحدیں مل جائیں گی) [۲۰]

شاہ محمد اسمٰعیل شہید، مولانا عبدالحئی بڈھانوی اور مفتی الٰہی بخش تینوں سید احمد شہید کے تربیت یافتہ اور ان کے قریبی مریدین میں سے تھے۔ وہ ہندوستان کی شرعی حیثیت کے بارے میں نہ صرف یہ کہ ان کے موقف سے پوری طرح متفق تھے، بلکہ

انھوں نے اپنے طور پر بھی ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ صادر کیا تھا اور یہ واضح کیا تھا کہ مسلمانوں پر جہاد کے فرض ہونے میں اب کوئی شبہ نہیں رہ گیا ہے۔۲۱

مولانا عبدالحئی بڈھانوی (جو شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے داماد تھے) نے تو بہت واضح لفظوں میں یہ خیال ظاہر فرمایا تھا کہ انگیزوں کے تسلّط کے بعد اب ان کے خلاف جہاد فرض کفایہ نہیں، بلکہ فرض عین ہوگیا ہے۔ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''شہرے از اہل اسلام بدست کفار افتاد و آنہا حکمرانی کنند، پس بذمہ ہم مسلمین فرض است کہ سعی در دفع کفار از اں شہر بعمل آرند و ایں صورت در اکثر بلاد ہندوستاں پدیدار شدہ چنانچہ پوشیدہ نیست۔ پس بر ہمہ مسلمین مقابلہ فرض است''

(مسلمانوں کے کسی شہر پر کفار کا قبضہ ہوجائے اور وہ وہاں حکم رانی کرنے لگیں تو تمام مسلمانوں پر فرض ہوجاتا ہے کہ اس شہر سے کفار کا تسلط ختم کرنے کی سعی کریں۔ ہندوستان کے اکثر علاقوں میں یہ صورت پیش آچکی ہے جو مخفی نہیں ہے۔ پس تمام مسلمانوں پر اس کا مقابلہ فرض ہے)۔۲۲

یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ 'تحریک آزادی میں علماء کا کردار' کے مصنف گرامی نے یہ ذکر کیا ہے کہ مفتی الٰہی بخش نے بھی ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا تھا اور یہ کہ انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں یہ فتویٰ محفوظ ہے، لیکن انڈیا آفس لائبریری کے کیٹلاگ میں ان کے محولہ اندراج نمبر کے تحت پٹنہ کے مولانا الٰہی بخش کے فتویٰ (بغیر عدم صراحت خاص مضمون) کا ذکر ہے۔ البتہ کیٹلاگ میں اس فتویٰ کے ذکر سے پہلے کاندھلہ کے مولانا الٰہی بخش کی ایک کتاب (موسوم بہ بکٹ کہانی) کے بارے میں معلومات مندرج ہیں۔۲۳

اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کی شرعی حیثیت پر علماء ہند کی رائیں یا اس مسئلہ پر ان کے باقاعدہ فتوے انیسویں صدی کی ابتدا سے منظرعام پر آنا شروع ہوگئے تھے اور تحریک آزادیِ ہند منظّم انداز میں بعد میں شروع ہوئی جو ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی پر منتج ہوئی۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ملک کی شرعی حیثیت کے مسئلہ پر

علماء کو متوجہ کرنے، ان کے توسط سے مسلم عوام کو اس کے سلسلہ میں بیدار کرنے اور انگریزوں کے خلاف ان میں تحریک پیدا کرنے میں اِن فتاویٰ کا بہت اہم رول رہا ہے۔ ان فتاویٰ کے پس منظر کے بارے میں پڑھ کر یا سن کر انھیں اپنی سماجی و سیاسی حیثیت (بالخصوص غلامی و محکومی) کا احساس ہوا اور وہ اس یقین تک پہنچ گئے کہ موجودہ صورت حال کی تبدیلی کے لیے جدّ و جہد کرنا ان کا مذہبی فریضہ ہو گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان فتاویٰ میں ملک کی شرعی حیثیت، محض ایک قانونی اظہار و اعلان کی نہیں تھی، بلکہ ان میں آزادی کی باقاعدہ جدّ و جہد شروع کرنے کے لیے زبردست ترغیب و تحریک بھی تھی۔ یہ امر بدیہی ہے کہ کسی مشکل و اہم کام کے لیے لوگوں کا ذہن تیّار کرنے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور علماء ہند کے فتاویٰ نے یقینی طور پر یہ اہم اور کٹھن کام انجام دیا۔ ان فتاویٰ سے نہ صرف یہ کہ تحریکِ آزادی کی نشو و نما کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے، بلکہ یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ علماء اس تحریک میں پیش پیش رہے ہیں اور یہ کہ ان کے فتاویٰ اس باب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اہم بات یہ کہ انگریز بھی اس کا اعتراف کرتے تھے۔ انھیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ علماء کے فتاویٰ عوام پر بہت گہرا اثر رکھتے ہیں۔ ان کے لیے یہ باعثِ تشویش تھا کہ جیسے جیسے اِس ملک میں ان کا سیاسی اثر و رسوخ بڑھ رہا ہے اور یہاں کے حالات میں تبدیلی آ رہی ہے، لوگ علماء سے رجوع کر رہے ہیں اور اس ملک کی شرعی حیثیت سے متعلق ان کی رائے معلوم کر رہے ہیں اور ہم سے تعلقات و معاملات کے بارے میں ان سے فتویٰ پوچھتے ہیں۔ ان کے لیے یہ بات بھی دردِ سر بن گئی تھی کہ بعض ممتاز علماء بالخصوص شاہ عبدالعزیز دہلوی اور مولانا عبدالحئ بڈھانوی نے اس ملک کو دارالحرب قرار دے کر اپنا موقف واضح کر دیا ہے۔ وہ یہ بھی شکوہ کرتے تھے کہ جیسے جیسے ہمارا اقتدار وسیع و مضبوط ہوتا جا رہا ہے اس باب میں علماء کے فتوی اور واضح انداز میں سامنے آتے جا رہے ہیں اور ہمارے خلاف مسلمانوں کے جوش و جذبہ میں اور اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان حقائق کی تصویر کشی خود ایک معروف انگریز مصنف ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر (W.W. Hunter) نے اپنی مشہور کتاب (THE INDIAN MUSALMANS)

میں کی ہے۔اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"As we gradually transferred the administration to our own hands, Pious Musalmans greaetly agitated touching the relation which they should hold to us. They accordingly consulted the highest Indian authorities on the point and both the celebrated men mentioned above (Shah Abdul Aziz and Maulana Abdul Hai) gave forth response ..... When we consolidated our power, the decisions of the Doctors became more and more distinct as to India being *Dar al Harb* . these Decisions have practical fruit, The wahabis, whose zeal is greater than their knowledge, deduce from, The fact of India being technically a country of enemy, the obligation to wage war upon its rulers." ۲۴

علماء کے فتاویٰ کی اہمیت اور اس کے اثرات کے بارے میں دیگر انگریز مصنفین کے بھی اس طرح کے بیانات کتابوں میں ملتے ہیں۔

یہاں یہ ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرات، مسلمانوں کے مذہبی وسماجی وسیاسی حقوق تلف ہونے کے پیش نظر شاہ عبدالعزیز نے اس ملک کے دارالحرب ہونے کا جو فتویٰ دیا تھا بعد کے دور (جب کہ یہ ملک پوری طرح ان کی گرفت میں آ گیا تھا) کے علماء اس فتویٰ کی تصدیق کرتے رہے، یا اس کی حمایت میں اپنے فتاویٰ جاری کرتے رہے، تاکہ ملک پر برطانوی تسلّط کے خاتمہ اور اس کی آزادی کی جدّ و جہد کے لیے مسلمانوں کی سرگرمیاں اور تیز ہو جائیں اور وہ اس مقصد کے حصول کے لیے مزید جوش وخروش کے ساتھ اپنی قربانیاں جاری رکھیں۔اس ضمن میں خاص بات یہ کہ متاخر علماء بھی شاہ عبدالعزیز کے فتویٰ کو بنیادی اہمیت دیتے رہے۔مثال کے طور پر شیخ

الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اپنے ایک مکتوب (بہ نام محمد صدیق، چاہ میراں، پنجاب) میں فرماتے ہیں:

''ہندوستان دارالحرب ہے۔ وہ اس وقت تک دارالحرب باقی رہے گا جب تک اس میں کفر کا غلبہ حاصل رہے گا۔ دارالحرب کی جس قدر تعریفات کی گئی ہیں اور جو شروط بیان کی گئیں ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، حضرت مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے اپنے فتاویٰ میں اس موضوع پر بحثیں فرمائی ہیں۔ ان پر کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکتا''۔[۲۵]

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے والے فتاویٰ نے تحریکِ آزادی کی بنیاد ڈالنے اور پھر اسے مہمیز دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے بعد بھی تحریک آزادی کے مختلف مراحل میں فتاویٰ جاری کیے گئے۔ ان میں وہ فتویٰ بڑی اہمیت کا حامل ہے جو جولائی ۱۸۵۷ء میں جامع مسجد دہلی میں مرتب کیا گیا اور ۳۳ یا ۳۴ علماء کے دستخط سے جاری ہوا۔ یہ تاریخی فتویٰ اس وقت ترتیب دیا گیا جب جنرل بخت خاں ۲ جولائی ۱۸۵۷ء کو دہلی پہنچے اور انگریزوں کے خلاف جدّ و جہد کو مزید منضبط کرنے اور آگے بڑھانے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس وقت دہلی میں صورت حال کافی نازک تھی اور انگریزوں کا ظلم اور زیادتی کافی بڑھ گئی تھی۔ اس صورت حال میں اس فتویٰ کے ذریعہ جہاد کو فرض عین قرار دیا گیا۔ یہاں استفتاء و فتویٰ کا متن نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

(استفتاء)

''کیا فرماتے ہیں علماء دین اس امر میں۔ اب جو انگریز دلی پر چڑھ آئے اور اہل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں، اس صورت میں اب اس شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟ اور اگر فرض ہے تو وہ فرض عین ہے یا نہیں؟ اور وہ لوگ جو شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ہیں ان کو بھی جہاد چاہیے یا نہیں؟ بیان کرو، اللہ تمھیں اجر دے گا۔''

(جواب)

''درصورت مرقوم فرض عین ہے اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے، اور استطاعت ضرور ہے اس فرضیت کے واسطے، چنانچہ اس شہر والوں کو طاقت مقابلے اور لڑائی کی ہے بسبب کثرت اجتماع افواج کے اور مہیا اور موجود ہونے والے آلات حرب کے، تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا اور اطراف وحوالی کے لوگوں پر جو دور ہیں باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے۔ ہاں اگر اس شہر کے لوگ باہر جائیں مقابلہ سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض عین ہوجائے گا اور اسی طرح اسی ترتیب سے سارے اہل زمین پر شرقاً اور غرباً فرض عین ہوجائے گا اور جو عدو بستیوں پر ہجوم اور غارت اور قتل کا ارادہ کریں تو اس بستی والوں پر بھی فرض ہوجائے گا بشرط ان کی طاقت کے''۲۶

اس فتویٰ پر دستخط کرنے والوں میں یہ حضرات شامل تھے: مولوی نور جمال، محمد عبدالکریم، سید محمد نذیر حسین، سکندر علی، رحمت اللہ، مفتی صدرالدین، مفتی اکرام الدین، سید رحمت علی، محمد ضیاء الدین، عبدالقادر، احمد سعید، مولوی عبدالغنی، مولوی محمد علی، فریدالدین، محمد سرفراز علی، محبوب علی جعفری، الٰہی بخش، محمد حامی الدین، سید احمد علی، محمد کریم اللہ، مولوی سعیدالدین، محمد مصطفیٰ خاں، محمد انصار علی، محمد ہاشم، حفیظ اللہ خاں، محمد نورالحق، حیدر علی، سیف الرحمٰن، سید محمد، محمد امداد علی، سید عبدالحمید، مفتی عدالت العالیہ محمد رحمت علی خاں اور قاضی القضاۃ محمد علی حسین۔۲۷

مشہور مجاہد آزادی مولانا فضل حق خیرآبادی (۱۷۹۷-۱۸۶۱ء) فتوی کے اجراء کے وقت (جولائی ۱۸۵۷ء) دہلی میں موجود نہیں تھے، وہ اگست میں یہاں پہنچے۔ بعض اہل قلم نے اس فتوی پر دستخط کرنے والوں میں ان کا نام غلط طور پر شامل کردیا ہے۔ البتہ ان کی بعض تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس فتوی سے متفق تھے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے بیان کے مطابق ''ان کا ایک الگ مستقل فتویٰ جہاد تھا جس کا ذکر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی اسلامی تاریخوں میں تفصیل سے کیا گیا ہے''۔۲۸

اس کثیر دستخطی فتویٰ نے مسلم عوام پر کافی اثر ڈالا۔ انگریزوں کے خلاف جدّ و جہد میں مزید تیزی آئی اور تحریکِ آزادی کے متوالے جوش و خروش سے معمور ہوگئے۔ ہزاروں لوگ جنگ میں شرکت کے لیے دہلی میں جمع ہوگئے اور ان میں بہت سے ایسے سامنے آئے جو ملک کی آزادی کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے یا اس پہلی جنگ آزادی کے دوران جو فتاویٰ جاری کیے گئے، انگریزوں کے خلاف فضا گرم کرنے اور لوگوں کو جدّ و جہد آزادی کی راہ میں سرگرم کرنے میں ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس جنگ کے بعد وہ علماء خاص طور سے برطانوی حکومت کے عتاب اور انتقامی رویّہ کا نشانہ بنے جنھوں نے مذکورہ بالا فتاویٰ جاری کیے تھے، یا ان کی تائید کی تھی۔ سزائے موت، کالا پانی، پُر مشقت قید و بند جیسی اذیت ناک سزائیں ان کو دی گئیں۔

کسی بھی اہم مقصد کے حصول کے لیے ملک کے عوام کے مختلف طبقوں میں اشتراک و تعاون کے جذبہ کا فروغ پانا ضروری ہوتا ہے۔ تحریکِ آزادی کے دوران اس کی ضرورت محسوس کی گئی، بلکہ اسے ضروری سمجھا گیا کہ مسلمان اور ہندو مل کر اس تحریک کو آگے بڑھائیں اور باہمی اشتراک وتعاون سے اس اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے جدّ و جہد کریں اور سچ پوچھیے تو اہلِ ہند کے اسی جذبہ نے آزادی کی منزل تک پہنچنا آسان بنادیا۔ اُسی دوران علماء ہند نے اس مسئلہ پر فقہی نقطۂ نظر سے بھی غور وخوض کیا اور بعض نے اس سلسلہ میں واضح طور پر اپنی رائے ظاہر کی کہ سماجی و معاشی معاملات میں ہندوؤں کے ساتھ اشتراک و تعاون میں کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ اس کی وجہ سے شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ لازم آتی ہو۔[۲۹] اسی طرح شرعی طور پر اس بات کو بھی جائز قرار دیا گیا کہ بوقت ضرورت غیر مسلموں کا تعاون حاصل کیا جاسکتا ہے۔[۳۰] سیاسی سطح پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا مسئلہ خاص طور سے ۱۸۸۵ء میں کانگریس پارٹی کے قیام کے بعد علماء کے مابین زیرِ بحث آیا۔ متعدد علماء نے فقہی نقطۂ نظر سے اس پر غور وفکر کرکے کانگریس میں شمولیت اور ہندو اور مسلم میں اشتراک و تعاون کے حق میں اور مسٹر

بیک کی قائم کردہ اور سرسید احمد کی حمایت کردہ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن (Indian patriatic association) کے خلاف اپنی آراء ظاہر کیں۔ مولانا عبدالقادر لدھیانوی کے صاحبزادگان مولانا محمد، مولانا عبدالعزیز اور مولانا عبداللہ نے ان فتاویٰ کو 'نصرۃ الابرار' کے نام سے مرتب کیا اور سو علماء کے دستخط کے ساتھ ۱۸۸۸ء میں شایع کرایا۔[۳۱] اس پر دستخط کرنے والوں میں شیخ الہند مولانا محمود حسن (۱۸۵۱-۱۹۲۰ء) اور مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۸۲۹-۱۹۰۵ء) بھی شامل تھے۔[۳۲] یہ رسالہ بڑے پیمانہ پر عوام میں تقسیم کیا گیا۔ یہاں یہ ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ ایک دفعہ ایک صاحب نے شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی (۱۸۷۹-۱۹۵۷ء) سے کانگریس میں شمولیت کے جواز وعدم جواز کے بارے میں استفسار کیا تو جواب میں یہ واضح فرمایا کہ ''یہ جماعت بلا کسی تفریق اہل ہند کے فطری وملکی حقوق واپس دلانے کے لیے جدّ و جہد کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے اور ملک کو آزاد کرانا اس کا نصب العین ہے۔ مسلمان اس میں ابتدا ہی سے شریک رہے ہیں گویا اس میں شمولیت میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے اور پھر آخر میں 'نصرۃ الابرار' کا حوالہ دیا کہ اس کے مرتب نے اس رسالہ میں اس مسئلہ پر بہت سے علماء کے فتاویٰ جمع کردیے ہیں، مزید تفصیل کے لیے یہ رسالہ دیکھا جاسکتا ہے۔''[۳۳] بہرحال 'نصرۃ الابرار' میں شایع شدہ فتاویٰ ہندو مسلم اتحاد اور ملک کے مفاد میں باہمی تعاون کا جذبہ بڑھانے میں مفید وموثر ثابت ہوئے۔ ظاہر ہے کہ انگریز اس کو کبھی پسند نہیں کرسکتے تھے، اس لیے کہ یہ ان کی جابرانہ حکومت کے لیے خطرہ کی گھنٹی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کے اہل کار 'نصرۃ الابرار' کی کاپیاں جہاں پاتے ضبط کرلیتے تھے اور علماء اسے بار بار شایع کرا کے تقسیم کرتے رہتے تھے۔[۳۴] اس سے بھی حکومت کی نظر میں فتویٰ کی اہمیت اور عوام پر اس کے اثرات کا مزید ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

یہ بات معروف ہے کہ تحریکِ آزادی مختلف مراحل سے گزر کر کامیابی کی منزل تک پہنچی۔ ان مراحل میں تحریکِ ترک موالات (Non-Cooperation) نمک ستیہ گرہ اور خلافت تحریک بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کے سلسلے میں علماء نے فتاویٰ

جاری کیے، یا اپنی فقہی آراء ظاہر کیں، جن سے بلاشبہ تحریک آزادی کو تائید وتقویت پہنچی۔ تحریکِ ترکِ موالات (یعنی حکومت کے ساتھ عدم تعاون یا اس کے مناصب، عہدوں اور خطابات سے دست بردار ہوجانے حکومت کی کونسلوں میں شرکت کو قبول نہ کرنے اور صرف ملکی مصنوعات استعمال کرنے) کی تحریک۔ ترکی میں حکومت برطانیہ کی مسلم مخالف پالیسی اور اہل ہند کے معاملے میں اس کے جابرانہ و غیر منصفانہ اقدامات کے خلاف تحریک جون ۱۹۲۰ء میں شروع ہوئی۔ خلافت کمیٹی اور کانگریس دونوں نے اسے اپنے پروگرام میں شامل کیا۔ اس ضمن میں برطانوی حکومت یا انگریزوں کے ساتھ تعاون کے عدم جواز پر شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا فتویٰ (تحریر کردہ ۳ ذی قعدہ ۱۳۳۸ھ/ ۱۹ جولائی ۱۹۲۰ء) بہت مشہور ہے۔ 'الانور' کے مؤلف جناب عبدالرحمٰن کوندو کے بیان کے مطابق اس فتویٰ کا متن ممتاز محدث و معروف مجاہد آزادی مولانا انور شاہ کشمیری (۱۸۷۵-۱۹۳۳ء) نے شیخ الہند کی ہدایت پر تیار کیا تھا اور یہ کہ اس فتوی کا متن اتنا جامع و مانع تھا کہ شیخ الہند نے کافی پسند فرمایا۔[۳۵] اس فتوی کو اس وقت اور زیادہ شہرت ومقبولیت ملی جب جمعیۃ العلماء کے کلکتہ اجلاس (منعقدہ ۶ ستمبر ۱۹۲۰ء) میں سینکڑوں علماء نے اس کی توثیق کی اور ۴۷۴ علماء کے دستخط کے ساتھ اسے شایع کر کے ملک کے مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا۔[۳۶] اس طویل فتویٰ کا ضروری حصہ ملاحظہ ہو:

''مالٹا سے واپس آ کر مجھ کو معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ارباب بسط وکشاد نے آخری طریقِ کار اپنے فرض کی ادائیگی اور اپنے جذبات وحقوق کے تحفظ کا قرار دیا ہے کہ وہ قرآن کریم کی صحیح اور ایک صریح تعلیم اور رسول اکرم ﷺ کے ایک روشن اسوہ حسنہ کو مضبوط تھام لیں اور نفع وضرر قومی کا موازنہ اور عواقب کی پوری جانچ کر کے اس کو بے خوف وخطر انجام تک پہنچائیں ... وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اعداء اسلام کے ساتھ تعاون و موالات کو اعتقاداً وعملاً ترک کر دیں۔ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت نا قابلِ انکار ہے اور ایک صادق مسلمان کی عزت کا ایسے

حالات میں یہی تقاضا ہونا چاہیے کہ وہ (۱) سرکاری اعزازوں اور خطابات کو واپس کردے (۲) ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کردے (۳) صرف اپنی ملکی اشیاء اور مصنوعات کو استعمال کرے (۴) سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے (۵) اس کے علاوہ جو تجاویز وقتاً فوقتاً شایع کی جائیں ان پر عمل کرے، بشرطیکہ اتباعِ شریعت کیا جائے اور عمل درآمد میں خلافِ حکم شرع کا ارتکاب پیش نہ کرے، نیز اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے کہ جن امور میں فساد و نقضِ امن کا اندیشہ ہو ان سے احتراز کیا جائے اور ہر کام میں افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال مدِّنظر رہے اور ارشاد عثمانؓ "**اذا احسن الناس فاحسن معھم واذ اساؤا فاجتنب اساء تھم**" (جب لوگ اچھا کام کریں تو ان کے اچھا کرنے میں شریک رہو اور جب برا کام کریں تو برائی سے بچتے رہو) کا لحاظ رکھنا ہر ایک امر میں مفید و ضروری سمجھا جائے۔ واللہ الموفق والمعین۔ العبد محمود حسن عفی عنہ دیوبندی -۳ ذی قعدہ ۱۳۳۸ھ۔[۳۷]

ترکِ موالات سے متعلق اس فتویٰ کی اشاعت و تقسیم کے بعد انگریزوں کے خلاف ماحول اور گرم ہوگیا۔ اِس کے زیرِ اثر بہت سے لوگوں نے حکومت کے عطا کردہ خطابات اور توصیفی اسناد واپس کردیے اور سرکاری ملازمتیں تیاگ دیں۔ خطابات واپس کرنے والوں میں جامع مسجد دہلی کے امام مولانا سید احمد بھی شامل تھے، جنھیں حکومت سے 'شمس العلماء' کا خطاب ملا ہوا تھا۔ اس زمانہ میں اس طرح کے فتویٰ کو جو اہمیت دی جاتی تھی اس کا کچھ اندازہ سید احمد کے اس خط سے لگایا جاسکتا ہے۔ جسے 'شمس العلماء' کا خطاب واپس کرتے ہوئے انھوں نے چیف کمشنر دہلی کو لکھا تھا۔ خطاب کی واپسی کی وجہ ظاہر کرتے ہوئے انھوں نے تحریر کیا تھا کہ علماء کے فتویٰ کی رو سے سرکاری اعزازات و خطابات کی قبولیت ناجائز ہوگئی ہے اور وہ اس فتویٰ کی خلاف ورزی نہیں کرسکتے۔ اس لیے کہ اسلامی قانون کے مطابق اس کی پابندی ضروری ہوگئی ہے۔ اس خط کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

''میرے پاس شہر کے سربرآوردہ اور معزز افراد کا ایک وفد، جس میں ہر طبقہ کے خیال کے لوگوں کے علاوہ علماء کرام پر مشتمل تھا، کل میرے پاس آیا۔ انھوں نے ایک فتویٰ بھی پیش کیا۔ وہ خطاب کی واپسی سے متعلق تھا۔ اسلامی قانون کے تحت مسلم عوام کو فتویٰ کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ میں اس فتویٰ کی وجہ سے کسی طرح انکار نہ کرسکا۔ اس فتویٰ کی حکم عدولی میرے لیے ممکن نہیں تھی۔ اس لیے اپنی قوم کے مطالبہ پر اپنا شمس العلماء کا خطاب، سند اور تحفہ واپس کرتا ہوں۔ (مورخہ ۳۰/اپریل ۱۹۲۰ء)''[۳۸]

بہرحال اس فتویٰ کے بڑھتے ہوئے اثرات محسوس کر کے حکومت نے اس کی ضبطی کے احکام جاری کیے اور اس پر دستخط کرنے والوں اور اس کی تائید و توثیق کرنے والوں کے خلاف کارروائی شروع ہوئی۔ مختلف مقامات سے بہت سے علماء کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا، جس کے نتیجہ میں وہ قید و بند کی سزا سے دوچار ہوئے۔[۳۹] بلاشبہ یہ فتویٰ بھی عوام میں تحریکِ آزادی کے معاملے میں بیداری پیدا کرنے اور اس کے کاز کو آگے بڑھانے میں مفید و معاون ثابت ہوا۔ اس پر یہ امر بھی شاہد ہے کہ خلافت کمیٹی اور آزادی کی جدّ و جہد میں مصروف دوسری تنظیموں نے اسے خاص اہمیت دی اور عوام میں اس کی تشہیر کو اپنے پروگرام کا حصہ بنایا۔

تحریکِ خلافت اور تحریکِ آزادی میں جو گہرا ربط و تعلق ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ دونوں تحریکیں باہم مربوط تھیں اور ایک کو دوسرے سے تقویت ملی۔ خلافت کمیٹی مارچ ۱۹۱۹ء میں علماء ہند کے اس موقف پر قایم ہوئی تھی کہ قانونی طور پر 'سلطانِ ترکی' ہی مسلمانوں کے خلیفہ ہیں، اس لیے موجودہ صورت حال میں پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے ضروری ہوگیا ہے کہ وہ ترکی خلافت کی بحالی کے لیے جدّ و جہد کریں۔ دراصل اس کمیٹی کے قیام میں بھی فتویٰ کا رول رہا ہے۔ فروری ۱۹۱۹ء میں انجمن مؤیّد الاسلام کی ایک میٹنگ (منعقدہ زیر صدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلی، بمقام فرنگی محل، لکھنؤ) میں یہ تجویز منظور کی گئی کہ ایک فتویٰ مرتب کیا

جائے جس میں منصب خلافت سے متعلق شریعت کے قوانین واضح کیے جائیں اور مختلف ملکوں کے علماء کے دستخط کے ساتھ اسے گورنر جنرل اور وزیرِ ہند (SECRETARY OF STATE) کو بھیجا جائے اور اس میں اس نکتہ پر خاص زور دیا جائے کہ خلافت سے متعلق انجمن مؤیّد الاسلام ہی کا موقف شریعت کے مطابق ہے، اس کے علاوہ کسی اور نقطۂ نظر کو شریعت کا نقطۂ نظر نہ سمجھا جائے۔[۴۰] علی برادران کی سربراہی میں خلافت کمیٹی نے باقاعدہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی اور نہ صرف عالمِ اسلام بلکہ اس ملک میں بھی حکومتِ برطانیہ کے مستبدانہ و غیر منصفانہ اقدامات کے خلاف احتجاج اور ان کی روک تھام کے لیے یہ ایک مضبوط آواز بن گئی۔ خلافت کمیٹی کی سرگرمیوں سے تحریکِ آزادی کو بڑی قوت و مقبولیت ملی۔ اس لیے کہ دونوں کا مطمحِ نظر برطانوی حکومت کے خلاف جدّ و جہد اور اس کے ناروا اقدامات سے نجات حاصل کرنا تھا۔ مہاتما گاندھی اور تحریک آزادی کے دوسرے رہنماؤں نے پوری طرح اس کی حمایت کی اور اس کی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے میں مدد دی۔ دوسری جانب خلافت کمیٹی نے تحریکِ آزادی کے مختلف پروگراموں میں تعاون دینے کے علاوہ ترکِ موالات سے متعلق مذکورہ فتویٰ کو خوب مشتہر کیا۔ ان سب سے اہم یہ کہ خلافت کانفرنس کے کراچی اجلاس (منعقدہ زیرِ صدارت مولانا محمد علی جوہر بتاریخ ۱۹ ستمبر ۱۹۲۱ء) میں اس فتوی کی حمایت میں ایک ریزولوشن منظور کیا گیا۔ اس کے تحت مسلمانوں کے لیے برطانوی حکومت کی پولس و فوج میں ملازمت کو ناجائز قرار دیا گیا۔ بعد میں اسے باقاعدہ ایک فتویٰ کی صورت میں مرتب کر کے علی برادران، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا نثار احمد اور پیر غلام مجید کے دستخط کے ساتھ شایع کیا گیا۔ خلافت کمیٹی نے ملک کے مختلف حصوں میں اس کی تقسیم کا اہتمام کیا۔[۴۱] حکومت نے کانفرنس کے اس ریزولوشن کا سخت نوٹس لیا جس میں فتویٰ کی بنیاد پر مسلم سپاہیوں سے فوجی خدمت چھوڑنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ حکومت نے علی برادران اور اجلاس کے اہم شرکاء کے خلاف بغاوت پھیلانے کا مقدمہ قایم کیا جو کراچی مقدمہ کے نام سے مشہور ہے۔ نتیجہ کے طور پر انھیں قیدِ با مشقت کی سزا جھلینی پڑی۔[۴۲] اِن جابرانہ و منتقمانہ اقدامات سے فتویٰ کا پیغام اور عام ہوا، تحریکِ آزادی کی لئے مزید بڑھی اور منزلِ مقصود کی طلب میں اہل ہند کے حوصلے اور بلند ہوئے۔

نمک ستیہ گرہ، جسے گاندھی جی نے ۱۹۳۰ء میں حکومت کے عوام مخالف نمک قانون کے خلاف شروع کیا تھا، تحریک آزادی کا بہت ہی اہم موڑ ثابت ہوا۔ غیر ملکی حکومت کی جابرانہ پالیسیوں کے سلسلہ میں عوام میں اس سے زبردست بیداری پیدا ہوئی۔ اس نے جدّ و جہد آزادی کی آواز کو گھر گھر پہنچادیا۔ اس نئے قانون کی رو سے نمک پر ٹیکس عاید کیا گیا اور ہندوستانیوں کے لیے نمک بنانا اور فروخت کرنا ممنوع قرار دیا گیا۔ اس طرح نمک سازی اور اس کے کاروبار پر حکومت کی اجارہ داری قائم ہوگئی۔ اس کی وجہ سے نمک کافی مہنگا ہوگیا۔ نتیجہ کے طور پر غریب لوگوں کے لیے کھانے کو لذیذ بنانے کا ادنیٰ سامان میسّر ہونا مشکل ہوگیا۔ اسی نامناسب اور استبدادی قانون کے خلاف گاندھی جی نے تحریک شروع کی۔ اس میں مسلمانوں نے بھی پورے جوش وخروش کے ساتھ حصہ لیا۔ علماء نے اپنی تقریروں وتحریروں کے ذریعہ اس تاریخی ستیہ گرہ کی نسبت عام مسلمانوں میں بیداری پیدا کی ۴۳؎ اور بعض نے اس قانون کے خلاف اپنی فقہی رائے ظاہر کی۔ نامور محدث مولانا انور شاہ کشمیری اس وقت جامعہ اسلامیہ (ڈابھیل، گجرات) میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انھوں اس قانون کی علانیہ مخالفت کی اور یہ فرمایا کہ ''مذہب اسلام میں نمک مباح الاصل ہے، جیسے ہوا، پانی اور خودرو گھاس''۔ گویا اسلام کے رو سے نمک جیسی عام استعمال کی چیز پر پابندی لگانا یا محصول عائد کرنا صحیح نہیں ہے۔'' ۴۴؎ بقول سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب ''شاہ صاحب کے اس اعلانِ حق کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں کے عام طبقہ کو نمک کی تحریک سے ہمدردی ہوگئی''۔ ۴۵؎

مزید براں وہ کہتے تھے کہ ''ہمیں یقین ہوگیا ہے کہ انگریز ہندوستان سے نکل جائے گا، کیونکہ اس نے قدرتی اشیاء پر بھی ٹیکس عائد کردیا ہے، ہوا پر ٹیکس، فضا پر ٹیکس، نمک پر ٹیکس، جن چیزوں کو قدرت نے آزاد رکھا تھا ان پر پابندی عائد کرنا قدرت کا مقابلہ ہے جس کے بعد زیادہ روز تک بقا نہیں ہوسکتی''۔ ۴۶؎ مشہور فقیہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی (۱۹۰۲-۱۹۸۴ء) نے یہ رائے پیش کی کہ کسی حکومت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ پانی ونمک جیسی عام استعمال کی چیزوں پر ٹیکس لگائے اور اگر کوئی حکومت ایسا کرتی ہے تو اس کے خلاف جدّ و جہد کرنا، اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنا ضروری ہے۔ ۴۷؎

یہاں یہ ذکر بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ نمک ستیہ گرہ کے دوران جب گاندھی جی سوراشٹر میں مقیم تھے تو مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (۱۹۰۱-۱۹۷۲ء) اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی گاندھی جی سے ملاقات کے لیے گئے اور ان دونوں حضرات نے نمک ستیہ گرہ کی حمایت کرتے ہوئے اس کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ اسی ملاقات کے دوران گاندھی جی نے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی سے دریافت کیا کہ سنا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کی کوئی ایسی حدیث ہے کہ نمک، پانی اور گھاس رفاہ عام کی چیزیں ہیں، اس لیے ان پر محصول عائد کرنا صحیح نہیں۔ مولانا نے اس کی تصدیق فرمائی اور جب حدیث کا متن ۴۸ اردو ترجمہ کے ساتھ گاندھی جی کی خدمت میں پیش کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ۴۹ اس طرح علماء ہند نے اس مسئلہ پر اپنی رائے ظاہر کر کے نمک ستیہ گرہ کو عوامی تحریک بنانے میں مدد بہم پہونچائی، جس سے بلاشبہ آزادئ ہند کی راہیں مزید ہموار ہوئیں۔

اوپر کے مباحث سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ تحریکِ آزادی میں علماء کے کردار کا ایک اہم حصہ اس کے مختلف مراحل میں اہم پروگراموں سے متعلق اپنی فقہی رائے ظاہر کرنا، یا فتاویٰ جاری کرنا تھا۔ ان سے اِن پروگراموں میں مسلم عوام کی دلچسپی اور سرگرمی میں اضافہ ہوا اور ملک کی آزادی کی جدّ و جہد میں ان کا جوش وخروش اور بڑھ گیا۔ تحریکِ آزادی کی راہ میں ان فتاویٰ کی اہمیت یہی تھی کہ انھوں نے برطانوی حکومت کے جابرانہ، مستبدّانہ اور غیر منصفانہ اقدامات کے خلاف عام مسلمانوں کے شعور واحساس کو بیدار کیا اور اس حکومت کے خاتمہ کے لیے ان کی جدّ و جہد کو اور تیز کیا۔ ان فتاویٰ کی اہمیت محسوس کرتے ہوئے تحریکِ آزادی کے دوران مختلف تنظیموں اور جماعتوں نے عوام میں ان کی عام اشاعت کو اپنے پروگرام کا اہم جز بنایا۔ دوسری جانب مجاہدینِ آزادی پر ان کے گہرے اثرات کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ تحریکِ آزادی کو کچلنے کے لیے دوسرے اقدامات کے ساتھ حکومت ان فتاویٰ کو ضبط کرتی رہی، ان کی اشاعت کو روکتی رہی اور ان کا اجراء اور تصدیق کرنے والوں کے خلاف سخت کار روائیاں بھی کرتی رہی۔ ان فتاویٰ کے سلسلہ میں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان سے ہندو مسلم اتحاد کو تقویت ملی اور ملک کی بھلائی و بہبودی کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا جذبہ

پروان چڑھا۔ آخر میں اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تحریکِ آزادی کے دوران میں جاری یا مرتب کیے گئے مذکورہ بالا فتاویٰ اس دور کے متعلقہ فتاویٰ لٹریچر کے محض کچھ اجزاء تھے۔ فتاویٰ کے مجموعوں، دارالافتاء کے ریکارڈ اور پرائیویٹ ذخائرِ کتب میں اس نوع کے بہت سے فتاویٰ منتشر و غیر مستعمل صورت میں محفوظ پڑے ہیں۔ انھیں تلاش کرنا، مرتب کرنا اور ان کا تجزیاتی مطالعہ کرنا اس لحاظ سے بھی مفید ہوگا کہ تحریکِ آزادی سے متعلق لٹریچر کا ایک اہم ذخیرہ سامنے آجائے گا اور اس سے اس تحریک کی تاریخ کے کچھ نئے گوشے واضح ہوں گے۔ اللہ کرے ہمیں اس کے ذریعہ علم فقہ و فتاویٰ اور اپنے وطن کی خدمت کی توفیق نصیب ہو۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

حواشی ومراجع

۱۔ فتوی کے اصول و آداب پر تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: غلام یوسف، فتوی کی ضرورت واہمیت، آداب وشرائط، فکر ونظر (اسلام آباد)، اپریل-جون ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۵-۱۵۸:
Encyclopedia of Islam (Article on *Fatwa*), E.J. Brill, Leiden, 1960,/866-867

۲۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: Zafarul Islam, *Fatawa literature of the Sultanate Period,* Karishka Publishers, New Delhi, 2005, pp,18-36

۳۔ سرور عزیزی (اردو ترجمہ فتاویٰ عزیزی از شاہ عبدالعزیز دہلوی)، مطبع مجیدی، کانپور (بدون تاریخ)، ۱/۲۰۶-۲۰۷

۴۔ سرور عزیزی، محولہ بالا، ۱/۳۶

۵۔ فیصل احمد بھٹکلی ندوی، تحریک آزادی میں علماء کا کردار (۱۸۵۷ء سے پہلے)، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۰۰۳ء، ص ۳۲-۳۳، ۱۵۸-۱۵۹

۶۔ خلیق احمد نظامی (مرتب)، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، علی گڑھ، ۱۹۵۰ء، ص ۸۸ (مکتوب نمبر ۲۵)

۷۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، فیوض الحرمین، (اردو ترجمہ: محمد سرور بعنوان 'مشاہدات و معارف' ترجمہ فیوض الحرمین)، سندھ ساگر اکادمی، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۲۵۵-۲۵۶

۸ تحریک آزادی میں علماء کا کردار، محولہ بالا، ص ۱۵۰ (حاشیہ)
۹ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، (مکتوب نمبر ۶)
۱۰ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ۱۱۸-۱۱۹
۱۱ تحریک آزادی میں علماء کا کردار، ص ۱۶۰-۱۶۱
۱۲ سعید احمد اکبر آبادی، ہندوستان کی شرعی حیثیت، دینیات فیکلٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، (بدون تاریخ)، ص ۳۷
۱۳ سرور عزیزی، ۱/۳۶
۱۴ حسین احمد مدنی، نقش حیات، ۲/۱۱، تحریک آزادی میں علماء کا کردار، ص ۲۴۶ (حاشیہ نمبر ۲)
۱۵ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ۶۰ (مکتوب نمبر ۵)
۱۶ تحریک آزادی میں علماء کا کردار، ص ۲۶۸
۱۷ تحریک آزادی میں علماء کا کردار، ص ۳۳-۳۴ (تقریظ از مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی)
۱۸ تحریک آزادی میں علماء کا کردار، ص ۳۶۶ (محولہ بیاض قلمی حضرت مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی مملوکہ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی)
۱۹ شاہ اسمٰعیل شہید (مرتب) صراط مستقیم (مجموعہ ملفوظات سید احمد شہید)، (اردو ترجمہ) کتب خانہ اشرفیہ راشد کمپنی، دیوبند (بدون تاریخ)، ص ۱۰۷
۲۰ غلام رسول مہر، سید احمد شہید، کتاب منزل، لاہور (بدون تاریخ)، ص ۲۵۵-۲۵۶
۲۱ ان کے فتاویٰ کے متون کے لیے ملاحظہ فرمائیں: تحریک آزادی میں علماء کا کردار، ص ۲۵۵-۲۵۶
۲۲ تحریک آزادی میں علماء کا کردار، ص ۲۷۱ (بحوالہ مکتوبات سید احمد شہید، اوراق ۶۷-۶۸)
۲۳ J.F.Blumhardt, *Catalogue of the Hindustani Manuscripts in the Library of India Office,* Oxford University Press, 1926, P.143 (No.268, U-130/III)
۲۴ W.W Hunter, *The Indian Musalmans,* Indological Book House, Delhi, 1969. PP 134-135.
۲۵ نجم الدین اصلاحی (مرتب)، مکتوبات شیخ الاسلام، مجلس یادگار شیخ الاسلام، کراچی، ۱۹۹۴ء، ۲/۱۰۱
۲۶ محمد ایوب قادری، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات)، کراچی، ۱۹۷۶ء،

ص۴۰۴-۴۰۶۔ یہ فتاویٰ اس زمانہ کے اخبارات 'ظفر الاخبار' اور 'صادق الاخبار' میں بھی شایع ہوئے تھے (حوالہ مذکور، ص۴۰۲)

۲۷ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، محولہ بالا، ص۴۰۵-۴۰۶، محمد سلمان منصور پوری، تحریک آزادی ہند میں مسلم علماء اور عوام کا کردار، مرکز نشر و تحقیق، مراد آباد، ۱۴۲۳ھ، ص۵۳-۵۴

۲۸ ہندوستان کی شرعی حیثیت ، ص۴۱-۴۲، نیز ملاحظہ کریں: فضل حق خیرآبادی، الثورۃ الہندیہ، مع اردو ترجمہ: باغی ہندوستان از محمد عبدالشاہد خاں، مبارک پور ۱۹۸۵ء، ص۲۱۵، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، محولہ بالا، ص۴۰۳-۴۰۴

۲۹ سید محمد میاں، علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی (بدون تاریخ)، ص۱۰۰-۱۰۱

۳۰ مکتوبات شیخ الاسلام، محولہ بالا، ۲/۱۰۳-۱۰۴

۳۱ رسالہ 'نصرۃ الابرار' پہلی بار مطبع صحافی، لاہور سے ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۸ء میں شایع ہوا تھا۔ عزیز الحسن صدیقی، کاروانِ فکر، مکتبہ حسن، غازی پور (بدون تاریخ)، ۱/۱۶۲، محمد ایوب قادری، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، ص۵۹۲، بعض اہل قلم نے 'نصرۃ الابرار' کی تالیف مولانا عبدالقادر لدھیانوی سے منسوب کی ہے جو صحیح نہیں ہے۔

۳۲ اس فتویٰ پر تفصیلی تبصرہ اور اس کے مرتبین کے بارے میں مختصر وضاحت کے لیے ملاحظہ فرمائیں: حسین احمد مدنی، نقش حیات، دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی، ۱۹۵۲ء، ۲/۱۷

Ishtiyaq Husain Qureshi, *Ulama in Politics* Renaissance Publishing House, Delhi, 1985, pp226-228

۳۳ مکتوبات شیخ الاسلام، ۲/۱۳۳

۳۴ کاروان فکر، محولہ بالا، ۱/۱۶۲

۳۵ عبدالرحمٰن کوندو (مولف و مرتب)، الانور، ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۷۹ء، ص۴۸۸-۴۸۹، محمد ازہر شاہ قیصر (مرتب)، حیات انور، شاہ منزل ، دیوبند، ۱۹۷۷ء، ص۳۱۰ (مضمون: محمد انوری، حضرت الاستاذ محدث کشمیری)

۳۶ تحریک آزادی ہند میں مسلم علماء او رعوام کا کردار، ص۹۳، سید محمد میاں ، اسیران مالٹا، الجمعیۃ بک ڈپو، دہلی، ۱۹۷۶ء، ص۲۵۲-۲۵۳

۳۷ اسیران مالٹا، ص۲۵۴

۳۸ سید ابراہیم فکری، ہندوستانی مسلمانوں کا جنگ آزادی میں حصہ، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء، ص۲۱۲-۲۱۳ (بحوالہ: (File No: F(125) Home Confidential

۳۹ اسیر ادروی، تحریک آزادی اور مسلمان، دارالمؤلفین، دیوبند، ۲۰۰۳ء، ص۱۹۶، تحریکِ آزادی میں مسلم علماء اور عوام کا کردار، ص۹۵

۴۰ محمد عدیل عباسی، تحریک خلافت، ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۸ء، ص۱۱۱

۴۱ رئیس احمد جعفری، سیرت محمد علی، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۵۰ء، ص۳۷۸-۳۸۱، تحریک خلافت، ص۱۸۳-۱۸۴، تحریک آزادی اور مسلمان، ص۱۹۸

۴۲ سیرت محمد علی، محولہ بالا، ص۴۷۸-۴۸۸، عبدالماجد دریابادی، محمد علی کی ذاتی ڈائری کے چند ورق، معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء، ۱/۹۹

۴۳ اس موضوع پر تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں: ظفر الاسلام اصلاحی، نمک ستیہ گرہ اور مسلمان، ماہنامہ الرشاد (اعظم گڑھ)، ۴۹/۱۹۱-۱۹۲، جولائی-اگست ۲۰۰۵ء، ص۲۰-۳۲

۴۴ الانور، محولہ بالا، (مقالہ: سبحان الھند احمد سعید، حضرت شاہ صاحب- ایک مکمل لائبریری) ص۴۲۴

۴۵ حوالہ مذکور، ص۴۳۵

۴۶ قاری محمد رضوان اللہ، مولانا انور شاہ کشمیری- حیات و کارنامے، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ ۱۹۷۴ء، ص۷۸

۴۷ کاروان فکر، محولہ بالا، ۱/۱۶۰

۴۸ حدیث کا متن یہ ہے: ایک صحابی (ابوبھیسۃ) نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول، کس چیز سے کسی کو روکنا جائز نہیں؟ فرمایا: پانی- اس نے پھر دریافت کیا: اے اللہ کے نبی- کس چیز سے کسی کو روکنا جائز نہیں؟ فرمایا نمک (**عن امرأة يقال لها بهيسة عن ابيها ... قال: يا رسول الله ! ما الشى الذى لا يحلّ منعه؟ قال: الماء. قال: يا نبى الله! ما الشى الذى لا يحلّ منعه ؟ قال: الملح) سنن ابى داؤد، كتاب الزكاة، باب ما لا يجوز منعه**، حدیث نمبر: ۱۶۶۹

۴۹ الجمعیۃ، مجاہد ملّت نمبر (دہلی)، ۱۹۶۲ء، ص۸۹، اسرار الحق قاسمی، ہندوستان کی جدید تاریخ کے معمار، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مجلّہ تذکیر (غازی پور)، سیریز نمبر ۴۱، ص۲۸